ڈاکٹر نسیم عباس احمر
لیکچرر
شعبۂ اردو، سرگودھا یونی ورسٹی، سرگودھا

میرزا ادیب کی ڈراما نگاری بی ترقی پسند اور نوآبادیاتی تناظر

ABSTRACT

Drama Writing of Meerza Adeeb in Progressive and Colonial Perspective

By Dr. Naseem Abbas Ahmar, Lecturer, Department of Urdu, Sargodha University, Sargodha.

Meerza Adeeb is prominent progressive drama writer of twentieth century, who tried to present the real consciousness of that time. As the result, he presented the helplessness of the poor in the ugly clutches of capitalism.. He unfolded the complexed and delicate minds of Indian people in his dramas who were in an extreme stress and were considering it as a total destruction and exploitation. So that the characters of his dramas show their extreme hatred towards the slavery and try to raise their voice against British rule. This article is a comprehensive study of Meerza Adeeb's drama writing in the perspective of colonization, zeitgeist of the time and progressive writing.

میرزا ادیب کی تخلیقی نثر میں ڈراما نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اُنھوں نے بصری تمثیلوں کے ساتھ ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے۔اُردو ڈرامے کی روایت میں اُن کے یک بابی ڈرامے اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔اُنھوں نے یک بابی و یک منظری ڈراموں کے ذریعے، افسانے اور ڈرامے کے تشکیلی عناصر کی باہمی مماثلت اور وحدت تاثر کو بھی نمایاں کیا، جو فکشن کے فن پر اُن کی مکمل دسترس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔اُن کے ڈراموں کے دس مجموعے، کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔اُن کے مطبوعہ ڈراموں کے سرمایے میں اٹھاسی (۸۸) ڈرامے شامل ہیں۔

میرزا ادیب کے ڈراموں میں رومانویت سے حقیقت نگاری کا سفر ملتا ہے۔اُن کے ڈراموں کی ابتدا، رومانی موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔مرد اور عورت کی محبت، مرد اور عورت کی بے وفائی، محبت کی ناکامی میں بدگمانی و غلط فہمی کا کردار، شوہر اور بیوی کی محبت، ماں بیٹے اور بہن کی بہن سے محبت، احساسِ تنہائی، تخیلی محبوب، اور یادِ ماضی جیسے موضوعات اُن کے رومانوی تخیّل کے کینوس کی تشکیل کرتے ہیں۔اُن کا بنیادی موضوع، انسان اور اس کے عمومی و معمولی مسائل کی غیر معمولی

پیشکش ہے۔وہ عام آدمی کے ڈراما نگار ہیں۔اُن کے ڈراموں میں متوسط اور زیریں متوسط طبقے کے کردار، معاشرے میں اپنے معاشی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ اظہار پاتے ہیں۔معاشرتی مسائل اور ان کی گرہ کشائی، اُن کی انسان دوستی کو مہمیز کرتی ہے۔حرص، لالچ، خوشامد، خودغرضی، طاقت ور کا قانون، رشتہ داروں کی مفاد پرستی، اقدار کی شکست و ریخت، اونچے طبقے کے معیارات، ظاہری شان وشوکت اور سیاہ باطنی، ان کے ڈراموں کے معاشرتی موضوعات کا حصہ بنتے ہیں۔میرزا ادیب کے ڈراموں میں؛نوآبادیاتی سامراج کے خلاف بغاوت، آزادی کی خواہش، غلامی سے نفرت، مسلم سپہ سالاروں کی جرأت، بہادری اور غداروں کا طرزِ عمل نمایاں ہے۔اُنھوں نے تاریخی شعور کے بیانیے میں برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے سپہ سالار، مشرقِ وسطیٰ کے مسلم تاریخی کردار و واقعات، اسپین، الجزائر کے فاتح مسلم سپہ سالار اہم ہیں۔تقسیمِ ہند کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات کے اثرات جیسے موضوع کو بھی ڈرامے کا قالب پہنایا ہے۔ذیل میں ان کے ڈراما نگاری میں ترقی پسندی اور نوآبادیاتی شعور کے اظہاریے کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

سرمایہ دارانہ چالوں، اشتراکیت اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر جن ڈراموں میں واضح ہے۔ان میں ''دروازہ''، ''سحر سے پہلے''، ''اجالوں کی گود میں'' اور ''لہو اور قالین'' اہم ہیں۔ڈراما ''دروازہ'' میں ایک خاندان، ایک مثالی شہر میں داخل ہوتا ہے۔ہر سہولت اور آسائش کا آدرش لیے وہ اس شہر سے تمام مطالبات کرتے ہیں لیکن اُن کے خوابوں کا محل، شہر والوں کے طرزِ عمل اور سرمایہ دارانہ چالوں کا شکار ہو کر دھڑام سے گرتا ہے۔وہ اس مقدس شہر کو فریب، رشوت، حق تلفی اور لوٹ کھسوٹ سے پاک خیال کرتے ہیں اور بہ ظاہر پاک شہر، باطن میں جو فریب رکھتا ہے، وہ آہستہ آہستہ ظاہر ہوتا ہے۔اونچے مکان، چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں، شاندار باغ، پھل، مٹھائیاں، عجیب وغریب موٹریں اور دکانیں انھیں دم بخود کر دیتی ہیں۔شہر کا حاکم اعلیٰ بھی شہر میں مساوات قائم کرنے اور دولت صرف امیروں کی تجوریں میں بند نہ ہونے دینے کا عہد کرتا ہے۔چند ہفتوں کے قیام کے بعد اخبارات، میڈیا کی دوعملیوں، صحت کے حوالے سے دواؤں کی بلیک میں پانچ گنا زیادہ قیمت، اپوزیشن لیڈر کی منافقتوں، امیروں کو ٹینڈر کے اجرا، غریب بستیوں کو پلازے میں تبدیل کرنے کے لیے رشوتوں کا استعمال، مل مالکان کی بیویوں کا غریبوں کے لیے خیراتی ادارے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں چلانے کا عمل؛ اُن پر سرمایہ دارانہ حکمتوں کو واشگاف کرتا ہے۔

ڈراما ''سحر سے پہلے'' میں بھی اشتراکیت کا نقطۂ نظر نمایاں ہوتا ہے۔ایک چور، ایک بوڑھی طوائف زہرا کے گھر چوری کے لیے آتا ہے۔ایک خالی گھر میں ایک بوڑھی طوائف زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔چور کے باطن میں موجود انسانیت بیدار ہو جاتی ہے۔وہ اُس سے اس کی زندگی کے حالات دریافت کرنے لگتا ہے۔بوڑھی طوائف بھی چور کے موجودہ روپ اختیار کرنے کے محرکات دریافت کرنے لگتی ہے۔دونوں باہم گفتگو سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانوں کے گناہوں کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی وجہ معاشرے کا موجودہ نظام ہے۔اگر ہر شخص کو اُس کا جائز حق ملے اور ہر شخص عزت کی زندگی بسر کرے، تو جرم کا نام ونشان بھی مٹ جائے۔ہر کوئی مجرم کے جرم کو دیکھتا ہے مگر اُس کے پیٹ کی خواہش مٹانے کے بارے

میں نہیں سوچتا، اگر معاشرہ کسی سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لے گا تو پھر زندہ رہنے کے لیے کوئی راستہ تو اختیار کرنا پڑے گا۔اُن دونوں کے نزدیک ظالم معاشرے کا ظالم نظام ختم کر دینا بہت ضروری ہے۔

ڈراما ''اجالوں کی گود میں'' جاگیردارانہ سوچ اور ترقی پسندانہ نقطہ نظر واضح طور پر منعکس ہوتا ہے۔سردار علی نواز مل مالک، جس کی راستے میں گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔جانی مزدور کی مدد کے صلے میں کچھ رقم دیتا ہے تو علی نواز کا بیٹا حق نواز اُس کی ممانعت کرتا ہے کہ سردار صاحب جس طرح کا رحم غریبوں پر کھا رہے ہیں، یہ جاگیرداری کی نشانی ہے جو عظمت کی بلندی پر کھڑا ہو کر غریب مخلوق کو دیکھتا ہے اور وہیں سے غریبوں کو خیرات کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔اُس کے نزدیک یہ غریب کی مدد کی بجائے احساسِ برتری کا نتیجہ ہے۔حق نواز کا نقطۂ نظر ترقی پسندانہ ہے۔اُس کے نزدیک، ہر شخص کو اس کی محنت کا اجر دینا ضروری ہے تا کہ وہ زندگی کی نعمتوں سے پیٹ بھرے اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔جاگیردارانہ رحم دلی، انسانیت کی توہین ہے اور انسانوں کو کسی سرمایہ دار کی رسی تھام کر زندگی کی سیڑھیاں بھی طے نہیں کرنی چاہئیں کیوں کہ اس طرح ان کے داخل کی آرزوئیں سرد پڑ جائیں گی۔اس ڈرامے میں محنت کرنے والے کو اُس کی محنت کے مطابق اجر دینے پر زور دیا گیا ہے۔

ڈراما ''لہو اور قالین'' میں سرمایہ داروں کے استحصالی رویے کو اجاگر کیا گیا ہے۔انھوں نے اس ڈرامے میں مزدوروں کی بجائے فن کاروں کے ساتھ استحصالی رویے کو نمایاں کیا ہے۔تجمل ایک سرمایہ دار ہے، جو اپنی ذات کی نمائش کے لیے مصوروں کی تلاش میں ہے تا کہ اُن کی تصویروں کی قدر افزائی سے شہر کا معزز اور قدر داں شہری کہلائے اور دوسری جانب تحائف میں تصاویر دے کر اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔اس مقصد کے لیے اُسے ایک غریب مصور اختر میسر آتا ہے اور اوّل انعام کا حق دار بھی ٹھہرتا ہے۔اختر اس محل اور شان دار سٹوڈیو میں آ کر خود کو مردہ تصور کرتا ہے کیوں کہ اس امارت اور نمائش نے اس سے اصل تخلیق کار، چھین لیا تھا اور وہ ڈیڑھ سال سے خود تصویریں بنانے کی بجائے کسی دوسرے غریب مصور سے تصویریں لاتا۔ایک تصویر پر اول انعام، اصل مصور کو ملنے کی بجائے اختر کو ملنے جا رہا ہوتا ہے تو اختر کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے کیوں کہ یہ خبر سن کر اصل مصور خودکشی کر لیتا ہے، اس ڈرامے میں سرمایہ داروں کے چاؤ چونچلے اور چالوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو فن کاروں سے اُن کی اصل فن کاری اور تخلیقیت چھین لیتے ہیں۔

میرزا ادیب کے ڈراموں میں حقیقت پسندی کا ایک روپ امیر و غریب کی چپقلش اور طبقاتی کشمکش کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔اس حوالے سے اہم ڈراموں میں ؛''سحر سے پہلے''، ''اجنبی''، ''خواب گریز پا''، ''بچہ گاڑی''، ''روشنی والا''، ''چنگاری''، ''نغمہ اسیرِ ساز''، ''تتلی'' اور ''اُجالوں کی گود میں'' شامل ہیں۔ڈراما ''سحر سے پہلے'' میں ایک چور، ایک بوڑھی طوائف کے گھر چوری کے لیے آتا ہے۔جس کے گھر کچھ نہیں۔چور اپنے چور بننے کی وجوہات اُسے بتاتا ہے اور وہ طوائف اُن حالات کا بیان کرتی ہے جنھوں نے اُسے طوائف بننے پر مجبور کیا۔دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو معاشرے کی سفا کی پر گہری چوٹ ہے کیوں کہ دنیا میں انسان سے اُس کا جائز حق بلکہ زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جائے تو انسان ایسے اعمال کی

طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ میرزا ادیب کہتے ہیں کہ اگر سوسائٹی کا نظام اس طرح بدل جائے کہ دولت، چند ہاتھوں تک محیط رہنے کی بجائے سب لوگوں میں تقسیم ہو تو ہر شخص زندگی سے محبت کرنے لگے۔

ڈراما ''اجنبی'' بھی معاشرے کے کردار و عمل پر تنقید ہے۔ معاشرے کا منفی کردار، جرائم کی نگہبانی کرتا ہے۔ معاشرہ طبقات میں بٹ کر انسانوں کو ذہنی و جذباتی کش مکش میں مبتلا کرتا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی اور محرومی، افراد کو ایسے راستے منتخب کرنے پر مجبور کرتی ہے جو اُسے گناہ اور جرائم کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ مذکورہ ڈرامے میں بھی پیش کردہ چور کا کردار اسی خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں چور کے پکڑے جانے کے بعد دو دوست؛ عزیز اور مسعود اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ چور ان لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں جو عالی شان کوٹھیوں کے سائے میں کپڑے اور روٹی کو ترستے ہیں اور ایسے جرائم اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کو جرائم کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ڈراما ''خواب گریز پا'' میں بھی امیر و غریب کا فرق، ایک نوجوان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ سلیم کی ماں، سلیم پر اندھا اعتماد کرتی ہے جو پیشے کے اعتبار سے ایک کلرک ہے اور اتوار کو بھی عیاشیوں میں مصروف رہتا ہے۔ اماں سمجھتی ہے کہ میرا بیٹا لائبریری یا کتابوں کی دُکان میں ہوگا اور رات گھر دیر سے آنے کو بھی بیٹے پر کام کا بوجھ تصور کرتی ہے۔ اسی طرح میز پر سگرٹوں کے انبار دیکھ کر اُسے خیال آتا ہے کہ یہ ضرور اُس کے دوست پیتے ہوں گے۔ بیٹے کی گیلی گیلی آنکھوں کو زیادہ پڑھنے کا نتیجہ سمجھتی ہے۔ کسی خاتون کی تصویر کی کمرے سے برآمدی کو بھی، کسی دوست کی کتاب سے گری ہوئی تصویر پر محمول کرتی ہے۔ منگیتر نگہت کی والدہ، اُسے کسی ڈانسر کے ساتھ ہوٹل میں دیکھنے کا ذکر کرتی ہے تو اماں اُسے سلیم کی کلاس فیلو سمجھتی ہے۔ اماں کے اندھے یقین کو اُس وقت ٹھیس پہنچتی ہے جب پولیس سلیم کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ سلیم کو نسرین ڈانسر سے محبت ہو جاتی ہے، مگر ایک معمولی کلرک کی محبت زیادہ دن ایک ڈانسر عورت کو رام نہ کر سکی۔ وہ دولت کی طرف جا لپکی اور سلیم اپنی آرزوؤں کا مدفن اٹھائے گھر واپس آ گیا۔ نسرین کے نئے دولت مند عاشق سے سلیم برداشت نہ ہوا تو اُسے تضحیک کا نشانہ بھی بنانا شروع کر دیا چناں چہ سلیم کی غربت، محبت میں دھوکے اور دولت مندوں کے طعن و تشنیع اور مذاق، اُسے اپنی محبوبہ کے دولت مند عاشق کا قاتل بنا دیتے ہیں۔ اس ڈرامے میں محبت کی کامیابی اور ناکامی میں امارت اور غربت کے کردار کو بہ خوبی اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈراما ''بچہ گاڑی'' میں میرزا ادیب نے امیر و غریب کے فرق کو اُجاگر کیا ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم جہاں افرادِ معاشرہ کو جرائم اور گناہوں کی دنیا میں لے جاتی ہے وہیں جذباتی و نفسیاتی سطح پر بھی مجروح کرتے ہوئے مستقل مایوسی اور حسرت میں مبتلا کرتی ہے۔ سراج اور مہراں کا ایک چھوٹا بچہ گڈو ہے۔ سراج ایک ایک روپیا جمع کر کے اپنے گڈو کے لیے بچہ گاڑی خریدنا چاہتا ہے۔ بچہ گاڑی خریدنے کے پیچھے سراج کی اپنے بچپن کی محرومیوں کا ازالہ بھی ہے کیوں کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اپنے گھر کے سامنے باغ میں امیروں کے بچوں کی گاڑیوں کو نوکروں کے ہاتھوں دھکیلتے ہوئے دیکھتا تو اس کے دل میں

اپنے لیے بچہ گاڑی کی خواہش مچلتی مگر جب باپ سے اس خواہش کا اظہار کیا تو تھپڑ اور دھکے ملے۔ سراج جب اپنے بچے کے لیے بچہ گاڑی خرید کر لاتا ہے تو مہراں وہم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ اسے سڑک پر نہ چلائیں اور وہ حادثات کا سوچ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے جب کہ سراج اُس کی ہمت بندھاتا ہے کہ ڈاکٹر کے دونوں بچے روز گاڑیوں میں بیٹھ کر سیر کرتے ہیں لہٰذا پریشان نہ ہو۔ اگلے دن سراج کو گھر میں ڈھونڈنے کے باوجود بھی بچہ گاڑی نہیں ملتی۔ اُسے محلے کی خاتون چرا کر لے جاتی ہے اور سراج کا ارمان، ارمان ہی رہتا ہے۔

''روشنی والا'' علامتی و استعاراتی اسلوب کا حامل ڈراما ہے جس میں امیروں کو غریبوں کا استحصال کرتے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح امیر اپنی امارت کے بل بوتے پر غریبوں کو کیڑے مکوڑوں اور جانوروں کے برابر سمجھتے ہیں اور لمحہ بہ لمحہ اُن کی عزتِ نفس کو مجروح کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور صنعت کار افراد اپنے مفاد کی خاطر سادہ منش دیہاتیوں کو ناقابلِ فراموش اذیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ روشنی والا سے مراد علم، آگہی، شعور اور ترقی ہے۔ ڈرامے میں موجود اندھے کا کردار جو روشنی سے خوف زدہ بھی ہے اور مخالف بھی۔ وہ روشنی کی تمنا کرنے والوں کو پاگل گردانتا ہے۔ اُس کے نزدیک روشنی، دوسرے انسانوں کا غاصب بنا دیتی ہے البتہ راحیل، روشنی کی تمنا رکھتا ہے۔ وہ اُمید کی روشنی کا طلب گار ہے۔ وہ اندھے اور اندھیرے کے خلاف ہے۔ روشنی جب راحیل کے کھیتوں کو روشن کرتی ہے تو اُس کے دل میں زندگی کی چمک پیدا ہوتی ہے لیکن صنعتی معاشرے کے ساہو کار اور سرمایہ دار، اُس کے کھیتوں کو اپنی ملز اور بنگلوں کے لیے بہترین جگہ قرار دیتے ہیں۔ وہ راحیل کو اُس کے گھر اور کھیتوں کی نقد قیمت دینا چاہتے ہیں مگر راحیل کے انکار پر فوراً دھمکی اور دھونس پر اتر آتے ہیں۔ صنعت کار اپنی بیوی سے گفتگو کرتے ہوئے راحیل جیسے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے۔ اس ڈرامے میں امیروں کو غریبوں کا استحصال کرتے دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے میں دو نقطہ ہائے نظر متوازی چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اول، آگہی کو اُمید سمجھنے کا رویہ ہے اور دوم، روشنی، اور ترقی کو ظالموں کے معاون کار قرار دینے کا انداز ہے۔ ڈرامے میں ایک بزرگ سردار کو روشنی یا علم کی تاریخ لکھتے ہوئے بھی پیش کیا گیا ہے، جس کے مطابق بہت سی اقوام نے اپنے عالموں اور محسنوں کو سزائیں دیں۔ ڈرامے میں موجود اندھے کا کردار روشنی کو انسان کا دشمن سمجھتا ہے، اُس کے نزدیک یہ روشنی ہی ہے جو ظالموں کو متحرک کرتی ہے اور وہ غریبوں سے اُن کے کھیت اور اُن کی عزت و ناموس تک چھین لیتے ہیں۔ غریبوں کے استحصال کے حوالے سے مکالمہ ملاحظہ ہو:

> زرینہ: یہ ہمارا کھیت ہے۔ پست قامت: کھیت ہے تو سر پر اٹھا کر لے جاؤ۔ یہاں پر ملز بنیں گی اور آج ہی سے کام شروع ہو رہا ہے...
>
> راحیل: ہم یہاں کچھ نہیں بننے دیں گے۔ یہ ہمارا کھیت ہے۔ یہ صدیوں سے ہمارے پاس ہے۔ ہمارے نگر دادا نے اسے خریدا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے یہاں فصلیں اگائی ہیں۔ دراز قامت: وہ زمانہ لد گیا۔ راحیل: یہ ہمارا کھیت ہے۔ پست قامت: کیا

بکواس لگا رکھی ہے۔ ہمارا کھیت۔ ہمارا کھیت، جاؤ جو جی میں آئے کرتے پھرو، بھاگو یہاں سے۔(۱)

اس مکالمے کی ہمہ گیریت، جس کی لاٹھی، اُس کی بھینس کی معنویت کو دوچند کر دیتی ہے۔ ڈراما ''چنگاری'' میں امیر و غریب کا فرق واضح طور پر نمایاں ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں نوکر اور مالک کا فرق، ملازموں پر ظلم، امیروں کی ظاہری شان و شوکت اور باطنی سیاہی کو پیش کیا گیا ہے۔ زیبو ایک یتیم لڑکی ہے جسے قاضی برجیس کی بیوی سہارا فراہم کرتی ہے۔ اس سہارے کا محرک ایک ملازمہ کی کمی کو پورا کرنا ہے لہٰذا ایک جانب تو اُس سے دن رات ملازموں کی طرح کام لیا جاتا ہے اور دوسری جانب معاشرے میں یتیم کی پرورش کرنے کے حوالے سے ناموری کا حصول بھی ہوتا ہے۔ محلے کی خواتین بھی ضرورت پڑنے پر اُسے کام کرانے کے لیے لے جاتی ہیں۔ جب زیبو کی شادی کی بات ہوتی ہے تو قاضی اور اُس کی بیوی جہیز کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ محلے کے مال دار خاں صاحب اپنے بھتیجے جبار کے لیے اُس کا رشتہ مانگ لیتے ہیں، جو ایک آوارہ اور بدمعاش نوجوان ہے۔ وہ ماقبل دو مرتبہ شادی کے بعد طلاق بھی دے چکا ہے۔ خاں صاحب شادی کے تمام اخراجات خود اٹھانے پر رضا مند ہو جاتے ہیں تو قاضی صاحب کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ البتہ اُن کا بوڑھا ملازم نوری اس رشتے کی مخالفت کرتا ہے، جسے وہ گھر سے نکال دیتے ہیں۔ گھر سے جاتے ہوئے نوری، زیبو کو بھی باپ بن کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ بیگم شوہر سے اُن کو روکنے کا واویلا کرتی ہے تو قاضی صاحب کہتے ہیں کہ جانے دو، اچھا ہے مصیبت ٹل گئی۔ اس ڈرامے میں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بے سہارا یتیم لڑکی کو بہ طور ملازم رکھنا معاشرتی مقام و مرتبے میں اضافہ کرتا ہے لیکن اس کے لیے شادی کے فرض کو مصیبت سمجھنا امراء کے باطنی کھوکھلے پن کا مظہر ہے۔

ڈراما ''نغمہ اسیر ساز'' میں بھی مالک کے ملازم پر روا رکھے جانے والے سلوک کے تناظر میں امیر غریب کی چپقلش کو واضح کیا گیا ہے۔ میرزا ادیب اس ڈرامے کے توسّط سے امرا کا استحصالی رویہ، تکبر اور منافقت کو آشکار کرتے ہیں جو دنیا کو دکھانے کی خاطر ظاہری طور پر غربا کی فلاح کا کام کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ انھیں مکمل طور پر غلام دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار، رانی ایک غریب گونگی لڑکی ہے جو حاکم کے گھر ملازم ہے۔ ناصر جمیل ایک مصور ہے جو رانی کی تصویر بناتا ہے۔ اُس زمانے میں رانی اپنے باپ کے ساتھ غریب گداگروں کے محلے میں رہتی تھی۔ رانی کا باپ، اپنی بیٹی کی تصویر بنانا پسند نہیں کرتا۔ روزینہ سیٹھ حاکم کی بیٹی ہے۔ نگہت، روزینہ کی سہیلی ہے۔ دونوں امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ امیر گھرانوں کے لوگوں کو آرٹ سے دلچسپی ہوتی ہے جس میں اکثریت دکھاوے اور شان و شوکت کی علامت کا اظہاریہ ہوتے ہیں۔ روزینہ، مصور ناصر کو پسند کرنے لگتی ہے جب کہ ناصر، رانی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ روزینہ، رانی کو اپنے گھر لے آتی ہے۔ ناصر، رانی کی نامکمل تصویر کو مکمل کرنا چاہتا ہے لیکن وہ رانی کے روزینہ کے گھر آ جانے کے بعد، سامنے ماڈل بنے بیٹھنے کے باوجود، اُس کی تصویر مکمل نہیں کر پاتا۔ جس کی آنکھوں کی گہرائی سے وہ معنی اخذ کرتا رہا اب وہ آنکھیں کینوس پر اُترنے سے

قاصر ہو جاتی ہیں۔روزینہ اپنی امارت اور رقابت کے سبب رانی کی آنکھوں بلکہ پورے وجود کو بے وقعت و بے معنی سمجھتی ہے۔اس کے نزدیک وہ معمولی سی گداگر لڑکی ہے لہٰذا وہ رانی کو اپنے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے ہی رکھتی ہے لیکن دنیا والوں کے سامنے یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اُسے ملازمہ کہنے کی بجائے بے سہارا کو سہارا دینے کا احسان کر رہی ہے۔گھر کا گلدان ٹوٹنے پر، سب اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اُسے تھپڑ مار دیا جاتا ہے۔ایک دن رانی وہاں سے بھاگ جاتی ہے تو ناصر، روزینہ کی جھوٹی شان و شوکت اور دولت کے گھمنڈ کی قلعی کھولتا ہے جب کہ روزینہ، رانی کے بھاگ جانے کو غریب لوگوں کی عادت شمار کرتی ہے۔اس ڈرامے میں امیروں کے غریبوں کا جھوٹا سہارا بننے اور ظالمانہ سلوک کو پیش کیا گیا ہے۔

ڈراما ''تتلی'' بھی مذکورہ بالا ڈراموں کی طرح غریب طبقے کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور امیروں کی اقدار کو بیان کرتا ہے۔ناصرہ سکول میں اُستانی ہے جو اپنی دُور کی بہن اقبال کے ہاں رہتی ہے۔اقبال کا شوہر غفور اُسے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور غریب ہونے کے باوجود اُس کی ضروریات کا بھی خیال رکھتا ہے۔خاں صاحب امیر آدمی ہے جو اپنی بھانجی کے لیے ناصرہ کو مستقل اُستانی کے طور پر رہنے کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔خاں صاحب کی بہن ثروت کی بیٹی، گڈی، ناصرہ سے بہت مانوس ہو جاتی ہے۔ثروت کا بھتیجا اکرم، ناصرہ میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور وہ ناصر کو اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہے جس پر خاں صاحب کوئی اعتراض تو نہیں کرتے لیکن ایک دن ناصرہ کی غریب بہن اقبال اور اُس کا شوہر غفور، اُس سے ملنے آتے ہیں۔غریب ہونے کے سبب، اُن کے خلوص کو رتی بھر اہمیت نہیں دی جاتی۔ثروت ناصرہ کو آئندہ ایسے غریب لوگوں سے ملنے سے منع کر دیتی ہے تاکہ ملنے جلنے والے ناصرہ کو معمولی گھر کی لڑکی نہ سمجھیں کیوں کہ اس طرح معاشرے میں اُن کی کیا عزت رہ جائے گی۔غفور بھی سمجھ جاتا ہے کہ امیر لوگ، غریب رشتہ داروں کو رشتہ دار نہیں سمجھا کرتے۔ناصرہ اس سخت برتاؤ سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور وہ ثروت کو دوٹوک بتا دیتی ہے کہ وہ اپنے اُس باپ کو نہیں بھول سکتی جو دن رات محنت کر کے خود میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا مگر اُس کے لیے اعلیٰ کپڑے خریدتا تھا، وہ اُس ماں کو بھی نہیں بھول سکتی جو چپڑاسن تھی، اسکول کی لڑکیوں کے بستے سر پر اٹھاتی تھی اور عزت و آبرو کی روٹی کھاتی تھی۔اس طرح وہ بدلتے ہوئے نئے معاشرے کے نئے اصولوں کو اپنا کر، اپنے حقیقی وجود اور روح کو قبر میں اتارنے سے انکار کر دیتی ہے۔میرزا ادیب کا یہ ڈراما غریب اور امیر طبقے کی اخلاقیات اور اقداری نظام کی بہ یک وقت پیش کش کے ذریعے قاری کے لیے موازنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔اقبال اور اس کا شوہر غفور کی صورت میں غریب طبقے کی سچائی، انسان دوستی اور ایثار کا پہلو سامنے آتا ہے۔خاں صاحب کا گھرانا، امارت کے نشے میں غریب طبقے کی حساسیت کو کچلتا چلا جاتا ہے۔ناصرہ کی صورت میں مصنف، معاشرے کے اس ناسور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

میرزا ادیب کے ڈراموں میں جہاں امیر و غریب طبقے کی آویزش کے نتیجے میں امراء کا استحصال اور ظلم کا بیان ملتا ہے وہیں وہ اِن دونوں طبقات کی پیش کش میں نئی جہات بھی پیدا کرتے ہیں لہٰذا اُن کا ڈراما ''اُجالوں کی گود میں'' میں امراء

اپنا ظالمانہ اور سفاکانہ رویہ ترک کر کے غرباء کے ساتھ ہمدردی اور احساس کا رشتہ استوار کرتے ہیں۔اس ڈرامے میں امیروں کی نظر سے غریبوں کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ واحد ڈراما ہے، جس میں امیروں کو غریبوں کی غربت زدہ زندگی کی مشکلات کا احساس ہے۔ڈرامے کا کردار بابا جانی ستر سالہ بوڑھا ہے، جو گدھے پر مٹی لاد کر شہر جا کر بیچنے کی مزدوری کرتا ہے۔ اُس کا بیٹا شادو، سائیکل ورکس اور بیٹا ابراہیم سفیدی کا کام کرتے ہیں۔سردار علی نواز فیکٹری کا مالک ہے۔راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو جاتی ہے تو بابا جانی انھیں پانی فراہم کرتا ہے اور باہم گفتگو میں اپنی بیتی زندگی کی محنتوں اور آمدہ زندگی کی آرزوؤں کو بیان کرتا ہے۔سردار علی نواز غریبوں کی زندگی کو زندگی گزارنے سے زیادہ، سزا پانے کے مترادف سمجھتا ہے۔اس کے نزدیک عیش و آرام پسند امیر لوگ، ان بدنصیب لوگوں کے الم ناک حالات کو سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن دوسری جانب بابا جانی اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہے۔ وہ سوکھی روٹی بھی مزے سے کھاتا ہے اور آرام سے زیادہ کام کو اہمیت دیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ کام جب غریب کی ہڈیوں میں رچ بس جاتا ہے تو پھر اُسے کام میں ہی مزا ملتا ہے۔اس ڈرامے میں محنت پسند انسانوں اور سہل پسندوں کے فرق کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما جہاں امیر طبقے کی نمائندگی کرنے والے سردار علی نواز کی احساس پسندی اور غریبوں کے لیے خلوص و ہمدردی کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے وہیں غریب طبقے کی محنت پسندی اور قناعت پسندی کو بھی پیش کرتا ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں میں امیر غریب کے فرق کے ساتھ ساتھ غریبوں کی حالت کا بیانیہ بھی نظر آتا ہے۔جا بجا غربت کی تمثالیں بکھری ہوئی ملتی ہیں، جن میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہے۔ایسے ڈراموں میں ؛''سوتیلی ماں''،''ستون''، اور ''دالان'' خاص طور پر شامل ہیں۔ڈراما ''سوتیلی ماں'' میں نچلے متوسط طبقے کی مشکلات کی طرف چند اشارے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے، جن کی تنخواہ دس بارہ دن چلتی ہے۔ بعد ازاں بیماریوں کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات، یا تو ادا نہیں کیے جاتے اور اگر کوئی چارہ نہ رہے تو قرض اٹھانے کا عمل بھی درپیش ہوتا ہے۔ڈراما ''ستون'' میں غریبوں کی آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کی تکمیل و عدم تکمیل کی کشمکش کے مضمرات کو بیان کیا گیا ہے۔اس ڈرامے میں ایک ملازم شخص کی زندگی میں گھر کے بجٹ کے حوالے سے ترجیحات، آرزوؤں کی تکمیل اور پھر حادثے میں فوت ہو جانے کے بعد، گھر کے بجٹ میں ترجیحات اور صورتِ حال میں واقع ہونے والی تبدیلی کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔انوری، ارشد کی بیوی ہے جو اُس کی زندگی میں اپنے میاں کے لیے نئے بوٹ، بوشرٹ، سگریٹ کے دوٹن، فونٹین پن، چائے کا بنڈل، بچے کے لیے فٹ بال، گھر کے لیے آرام کرسی، بیٹی کے لیے چوڑیاں، بچوں کی تعلیم کے لیے بنک میں بیس روپے جمع کروانے اور تفریح کے لیے پکچر اور پکنک کا خرچ، گھر کے بجٹ میں رکھتی ہے۔ارشد کی وفات کے بعد گھر کے بجٹ میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اُن میں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ چوں کہ مٹی کے تیل پر خرچ کم آتا ہے لہٰذا رات کے وقت لالٹین جلائی جائے گی اسی طرح باورچی خانے میں بھی لالٹین جلے گی کیوں کہ وہاں بجلی کی روشنی اچھی نہیں لگتی۔کپڑا سینے کی مشین کرائے پر لی جائے گی اور استری کی ضرورت نہیں لہٰذا اسے بیچ دیا

جائے گا اور کرسی کی بھی ضرورت نہیں۔ چوں کہ دو سو تیس روپے کا قرض بھی ہے لہٰذا بنک میں بچوں کی تعلیم کے لیے جمع رقم، قرض چکانے میں کام آ سکتی ہے۔ ارشد کے مرنے کے بعد پیدا ہونے والے حالات کے سبب، بیٹے خالد کے ایم۔اے کرنے اور بیٹی بانو کا لیڈی ڈاکٹر بننے کا خواب، آنسوؤں میں بہتا دکھائی دیتا ہے۔

ڈراما ''دالان'' میں غریبوں کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی اصول پسندی کو پیش کیا گیا ہے۔ زرینہ اپنی بیماری کے لیے کئی ڈاکٹروں سے دوا لے لیتی ہے لیکن صحت یاب نہیں ہوتی۔ ہمسائی زرینہ کی ماں کو ڈاکٹر احمد اکرام کے بارے میں بتاتی ہے جو اصول پسند ڈاکٹر ہے اور امیر و غریب سے یکساں فیس لیتا ہے۔ ڈاکٹر، زرینہ کے چیک اپ کے لیے آتا ہے تو زرینہ کا باپ اُسے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھی اُسے دیکھ کر وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ دراصل وہ دونوں بھائی تھے۔ زرینہ کا باپ جب چھوٹا تھا تو وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس رہنے گیا لیکن بڑا بھائی جھڑکتا رہتا تھا اس لیے وہ وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر احمد اکرام، اپنے بھائی آصف کے گھر اُسے بھائی کی حیثیت میں ملنے آ جاتا ہے لیکن آصف اُسے اپنی زندگی کی مصیبتوں اور ٹھوکروں کا ذمے دار ٹھہراتا ہے چناں چہ ڈاکٹر تلخ حقائق کی پردہ کشائی یوں کرتا ہے:

> ہم دونوں نے ایک غریب گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ تم جانتے ہو۔ ہمارے والد ایک مشہور حکیم تھے۔ ان کے یہاں صبح و شام مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کے باوجود گھر میں غربت رہتی تھی... وہ بڑے با مروت انسان تھے۔ مریضوں سے دواؤں کی قیمت تک نہیں لیتے تھے۔ ہماری ماں ہر روز چیختی تھی... ایک دن چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گئیں، جس دن وہ فوت ہوئیں گھر میں کفن کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اُن کی نعش گھر کے دالان میں پڑی تھی اور والد شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ تمھیں اس معاملے کی خبر نہیں ہے کیوں کہ تم اس وقت سات سال کے بچے تھے اور میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ میں ماں کی بے عزتی اور باپ کی پریشانی محسوس کر رہا تھا اور لگتا تھا جیسے میرے ذہن میں گرم گرم نشتر سے چبھ رہے ہیں۔ شام تک ماں دالان میں پڑی رہی، پھر ہمسایوں نے چندہ اکٹھا کیا اور جنازہ اٹھایا۔ (۲)

اس ڈرامے میں غریبوں کی اُصول پسندی اور با مروت ہونے کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات کو بہ خوبی پیش کیا گیا ہے۔ دونوں بھائیوں کا باپ جو حکیم تھا، اپنی اصول پسندی اور با مروت ہونے کے سبب نقصان اٹھاتا ہے۔ وہ مریضوں سے اکثر فیس نہ لیتا تھا۔ اُس کے اس لحاظ اور اصول پسندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی بیوی کی نعش گھر کے دالان میں پڑی ہوتی ہے اور اُس کے پاس اس کی تجہیز و تدفین کے بھی پیسے نہیں ہوتے۔ یہ منظر ڈاکٹر احمد اکرام کے ذہن پر اتنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے کہ وہ امیر و غریب سے علاج کی یکساں فیس وصول کرتا ہے اور باپ کی شخصیت میں موجود مروت اور لحاظ

ڈاکٹر احمد کی شخصیت میں اُصول پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔میرزا ادیب، اس ڈرامے کے وسیلے سے غربت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مسائل اور معاشرے میں موجود بیگانیت اور بے پروائی کو پیش کرتے ہیں جہاں ہر شخص دوسرے کے حقوق کا خیال رکھے بغیر محض اپنے مفادات کا حصول کرتا ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں میں طبقات میں بٹا ہوا معاشرہ پوری طرح جیتا جاگتا اور سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔امارت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سفاکی و بے حسی اور استحصال پر مبنی تمثالیں اپنے تمام تر رنگوں اور زاویوں کے ساتھ ابھرتی ہیں۔اسی طرح غربت کے بیانیے اور اِس سے جُڑے مسائل اور پیچیدگیوں کی پیش کش میں خاص مہارت کا ثبوت دیا گیا ہے جس میں اصلاح کا پہلو بھی مضمر ہے۔وہ امیر و غریب طبقے کے اخلاقی و معاشری معیارات کو بہ طور خاص موضوع بناتے ہیں، جس سے یوں لگتا ہے کہ اُنھوں نے اِن دونوں طبقات کا بہ غور مشاہدہ کیا ہے۔اونچے طبقے کے معیارات جن ڈراموں میں اپنا روپ دکھاتے ہیں ان میں؛''بہن''،''لہو اور قالین''،''لفافے''،''دروازہ''،''ماموں جان اور ماموں جان''، ''چنگاری'' اور''نغمہ اسیر ساز'' شامل ہیں۔ڈراما''بہن'' کا مرکزی کردار نزہت امیر گھر کی بیٹی ہے،جس کے نزدیک بنگلے اور کار کے بغیر زندگی بے معنی ہے اور صرف ولایت ہی مہذب لوگوں کی جگہ ہے۔ وہ اپنی دوست کی گونگی ملازمہ کو جانور سمجھتی ہے۔ ڈراما''لہو اور قالین'' امیروں کے مشاغل،نمود و نمائش اور شہرت کے ہتھکنڈوں کو پیش کرتا ہے۔تجمل ایک سرمایہ دار شخص ہے جو وہ آرٹسٹوں کی قدر افزائی سے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔مصور اختر کو اپنے گھر میں ٹھہرا کر اُس کی تصویریں، شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں کراتا ہے اور شہرت سمیٹتا ہے چناں چہ اپنی امارت اور شخصیت کی نمائش کے لیے ایک غریب مصور کے فن کو سیڑھی بناتا ہے۔ڈراما''لفافے'' میں امیر طبقے کی محبتوں کے حوالے سے اقدار کو موضوع بنایا گیا ہے۔امیر مردوں کو دوستوں کی بیویوں سے خط کتابت کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے مثال کے طور پر شیخ صلاح الدین، بیگم عرفان کو خط لکھتے ہیں اور شیخ صاحب کی بیگم صاحبہ ریاض بشیر کو خط لکھتی ہیں۔جب دونوں خطوط ایک دوسرے پر عیاں ہو جاتے ہیں تو دونوں آپس میں اپنی خوشیوں کی حفاظت کرنے اور دشمن کی حرکتوں کو اہمیت نہ دینے کا عہد کر کے فرشتہ صفت سیرت اپنا لیتے ہیں۔ بعد ازاں فلم دیکھ کر وہ اپنی باہمی محبت کو دوبالا کرتے ہیں اور دشمن کی ناکام سازش پر اپنی ذہانت کو داد دیتے ہیں۔

ڈراما''دروازہ'' میں بیوروکریسی، سرمایہ داروں، فلاحی تنظیموں اور اخبارات کے مالکان کے آپسی تعلقات،طرزِ زندگی اور منافقت کی قلعی کھولی گئی ہے۔ایک وقت میں تین لائسنسوں کا اجرا، ٹینڈر کے اشتہار کے بدلے میں نئے ماڈل کی گاڑی کا انتظام معمول کی بات ہے۔سیٹھ صاحبان کے بلڈنگ کے ناجائز قبضوں کو چھپانے اور اپوزیشن کا منہ بند کرنے کے لیے اخبارات والوں کو دفتر بنانے کے لیے پرانی کوٹھیوں کی پیش کش بھی عام ہے۔فلاحی ادارے، افسروں کی بیگمات کے ادارے بن جاتے ہیں۔ پارٹیاں عام ہوتی ہیں جن میں چیف سیکرٹری کے بیٹے کی سالگرہ، اعلیٰ افسر کے ہاں چائے، نئی فلم کا

سنسر شو دیکھنے جیسی تقریبات؛ قربت کے بہانے بن جاتی ہیں۔ کتوں کے علاج کے لیے اچھا ڈاکٹر نہ ملنے کی شکایات بھی باہم گفتگو کا موضوع بنتی جو ڈرامے میں المیاتی تاثر پیدا کرتی ہے کہ جہاں اِنسانوں کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں وہاں کتوں کے علاج کو موضوعِ بحث بنانا، غریبوں کی غربت کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔ ڈراما ''ماموں جان اور مامون جان'' میں اونچے اور اعلیٰ طبقے کے بزرگوں کی نفسیات اور اقدار کو پیش کیا گیا ہے۔ خاں صاحب اونچے طبقے کے فرد ہیں، پنجابی دھنوں کی نشریات کو کلچر کی بجائے ایگریکلچر سمجھتے ہیں۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو بدتمیز اور بے ہودہ خیال کرتے ہیں۔ علی اشرف اور رحیم اعلیٰ سوسائٹی کی اقدار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> مجھے ایسی سوسائٹی میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوگا۔ جہاں لوگ اپنی روح اپنے گھر پر چھوڑ جاتے ہیں اور جہاں سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں ہے۔ جھوٹے قہقہے، جھوٹا پیار، جھوٹا خلوص... یہاں تک کہ نفرت بھی جھوٹی، سب کچھ جھوٹا... واہ جی! بڑے افسر اپنے سے بڑے افسروں کی خوشامد کریں تو فٹافٹ ترقی پائی اور ایک نوکر اپنے مالک کی ذرا تعریف کر دے تو میراثی بن جائے۔ (۳)

ڈراما ''چنگاری'' میں اعلیٰ طبقے کی ظاہری شان و شوکت اور سیاہ باطن کو پیش کیا گیا ہے۔ قاضی جلیل اور ان کی بیگم ایک یتیم لڑکی زیبو کو سہارا دیتے ہوئے اپنی بیٹی کہہ کر گھر لے آتے ہیں۔ دنیا والوں کی نظر میں وہ انسان دوست اور رحم دل ہیں مگر حقیقت میں وہ اُسے نوکرانی تصور کرتے ہوئے ظلم کرتے ہیں۔ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچتی ہے تو جہیز کے خوف سے شہر کے ایک معزز آدمی خان صاحب کے آوارا بھتیجے سے شادی کرانے کا فیصلہ کرتے ہیں کیوں کہ خان صاحب بغیر جہیز کے اُسے قبول کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس ڈرامے میں مالکوں کے نوکروں پر ظلم، ان کی جھوٹی شان و شوکت اور امیروں کے ظاہری و باطنی تضادات کو عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما ''نغمہ اسیر ساز'' میں بھی امیروں کی خود غرضی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ روزینہ اپنی امارت کے بل بوتے پر غریب گونگی لڑکی کو اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ ناصر کا رانی میں دلچسپی لینا اُسے بہت بُرا لگتا ہے اور وہ اپنی خود غرض محبت کی کامیابی کے لیے اس گونگی لڑکی کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس ڈرامے میں امیروں کی محبتوں میں خود غرضی کے عمل دخل کو بہ خوبی بیان کیا گیا ہے۔

میرزا ادیب کے ڈراموں کی نمایاں خصوصیت، سامراجی ذہنیت اور نوآبادیاتی طرزِ فکر پر ایک فن کار کے تخلیقی ضمیر کی بیداری ہے۔ اُن کے ڈراموں ''نند کمار''، ''جمیلہ'' اور ''کالا آدمی'' میں نوآبادیاتی شعور طور پر واضح دکھائی دیتا ہے۔ ڈراما ''نند کمار'' میں نوآبادیاتی اور سامراجی ذہنیت کے واضح نقوش کے ساتھ محبِ وطن اور غدارِ وطن ہندوستانیوں کی شبیہیں نمایاں ہوتی ہیں۔ نند کمار، بنگال کے صوبے دار کے منصب کا خواہش مند تھا لیکن جنرل وارن ہیسٹنگز نے رضا خاں کو سات سال بنگال کا صوبے دار بنائے رکھا جس نے کم از کم تین کروڑ روپیا لوٹا، نند کمار کے بتانے کے بعد گورنر جنرل نے اس کے خلاف کوئی

تادیبی کارروائی نہیں کی کیوں کہ رضا خاں نے گورنر جنرل کو دس لاکھ کی رشوت دی۔ میر جعفر کی بیوی مُنّی بیگم نے بھی نواب بنگال کی محافظ مقرر ہونے کے لیے گورنر جنرل کو ڈھائی لاکھ کی رشوت دی جس کا ثبوت اُس نے نند کمار کو خط لکھ کر دیا۔ نند کمار کے گورنر جنرل پر رشوت کے الزام کے بعد، کمپنی کی حکومت الزامات کی زد میں آ گئی۔ اپنی ساکھ کو بحال رکھنے کے لیے نند کمار کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقصد کے لیے ایک جوہری موہن سرت داس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ نند کمار پر یہ مقدمہ بنایا گیا کہ ایک صراف بلاقی داس نے قرض خواہوں میں اپنی جائیداد کی تقسیم کرنے کی وصیت کی تھی اور موہن پرشاد کو مختار نامہ لکھ کر دیا تھا۔ اس کے بقول نند کمار نے بدری داس کی بیوی سے اڑتالیس ہزار رُوپے وصول کرنے کی جعلی تحریر تیار کی تھی۔ انگریز حکومت نے اس مقدمے میں نند کمار کو سولی چڑھانا مناسب سمجھا کیوں کہ یہ شخص اُن کے اقتدار کے لیے ایک چیلنج بن چکا تھا۔ اس ڈرامے میں انگریزوں کی باہمی گفتگو سے سامراجی اور نوآبادیاتی ذہنی صورتِ حال اور نند رکمار کی گفتگو سے انگریز چالوں اور نوآبادیاتی طرزِ حکومت کی قلعی کھول دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حب الوطنی کے مظاہر بھی جھلکتے ہیں۔ نواب سراج الدولہ کے محل کی خوب صورت اور قیمتی اشیاء جس طرح ولایت بھجوائی گئیں یا ہندوستانی سرکاری بنگلوں اور دفاتر کی زینت بنیں یا کمپنی کے اہل کاروں نے گورنر سے مراعات حاصل کرنے کے لیے تحفے میں دیں، یہ ساری صورتِ حال نو آبادیاتی ضمیر کی عکاس ہے۔ انگریزوں کے نزدیک ہندوستانی آپس میں الزام لگانے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ دو آدمیوں کو لڑاتے ہیں۔ دونوں کو اسلحہ دیتے ہیں۔ یوں مرنے والے سے نجات حاصل کرتے ہیں اور زندہ رہ جانے والے کو سہارا دیتے ہیں۔ نند کمار، انگریزوں کے عزائم کا پردہ اس طرح چاک کرتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو آپس میں لڑا کر دولت پر قابض ہو رہے ہیں۔ وہ انھیں مکار، غاصب اور لٹیرا سمجھتا ہے، وہ خود کو اجنبی قوم کی ناانصافی، ظلم اور لوٹ مار کو مٹا دینے والا آدرش قرار دیتا ہے۔ انگریز بھی باہمی گفتگو میں نند کمار کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی انگلستان کا تاج برطانیہ اور گورنر جنرل کی توہین کا مرتکب بھی سمجھتے ہیں۔ جنرل وارڈن ہیسٹنگز کے یہ خیالات ہندوستان میں انگریز حکومت کے قیام کے اصل اصول ہیں جو نوآبادیاتی ریاستوں کا سبب بنے، ڈرامے سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ہمیں نکالنے کے لیے ایک نند کمار نہیں ہزاروں نند کمار کی موت کی ضرورت ہے۔
> ہزاروں نند کمار مریں گے جب کہیں جا کر انگریز قوم ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگی۔
> آج ایک نند کمار کے مقابلے میں یہاں ہزاروں موہن پرشاد موجود ہیں اور ہماری کامیابی یہی ہے کہ ہم موہن پرشادوں کی تعداد میں اضافہ کرتے جائیں۔ (۴)

محبِ وطن ہندوستانیوں کی بجائے غدّارانِ وطن کی بڑھتی ہوئی تعداد ہی انگریز اقتدار کو طول دینے میں معاونت کرتی رہی۔ یہی وہ اُصول ہیں جس پر سامراجی اقتدار کی بنیاد ہے۔

ڈراما ''جمیلہ'' بھی استعماری و نوآبادیاتی شعور کے ساتھ وطن پرستی کی مثال ہے۔ ''نند کمار'' ہندوستان پر برطانوی

سامراج کی کہانی تھی جب کہ ''جمیلہ'' میں الجزائر پر فرانسیسی قبضے اور استعماری صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے۔جس طرح الجزائر کے قومی شاعر قاسم کو شہید کیا گیا اُسی طرح حبِ وطن الجزائروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔اس ڈرامے میں استعماری قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار آزادی، الجزائریوں کی بہادری، جرات اور منصوبہ بندی و منصوبہ سازی کو بھی نمایاں کیا گیا۔ جمیلہ مجاہدین آزادی کی سیاسی تنظیم ''محاذِ قومی آزادی'' کی ایک رکن ہے جو جاسوسی اور پیغام رسانی کے ساتھ زخمیوں کی طبی مدد کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔فرانسیسیوں کو اس کی دن رات کی کارروائیوں کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔جمیلہ نے تنظیم کے نئے ممبران کو اپنے لہو سے آزادی کے معاہدے پر دستخط کرنے کی رسم کو بھی بند کر دیا، اُس کے نزدیک مجاہدوں کا لہو کاغذوں پر نہیں بلکہ الجزائر کی سرزمین پر بہنا چاہیے۔جب وہ گرفتار ہو جاتی ہے تو اُسے خفیہ ٹھکانوں کی معلومات کے حصول کے لیے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔اُس کے نزدیک اُسے برہنہ کر کے مارنے میں فرانسیسی تہذیب برہنہ ہوئی ہے۔اُس پر ملک میں امن و امان برباد کرنے، باغیوں کی جاسوسی کرنے اور دو بم نصب کرنے کے جرم عائد کیے گئے۔اس کے نزدیک آزادی کی جنگ کرنے والوں کی مدد کرنا، کوئی جرم نہیں اور بم رکھنے سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔اُس کے خلاف عدالت میں بم نصب کرنے کے حوالے سے جھوٹے چشم دید گواہوں سے گواہی بھی لی گئی۔جھوٹے گواہ اور غدارانِ وطن، ہر ملک و سماج میں مل جاتے ہیں۔وہ عدالت میں فرانسیسیوں کے تاریخی شعور کو جھنجھوڑتی ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب فرانس میں انقلابیوں نے جابر حکمرانوں کے خلاف ظلم و ستم کے خلاف بغاوت کی تھی۔دنیا کو آزادی اور روشنی کا پیغام دینے والا فرانس، آج الجزائر کو غلامی کا طوق پہنا رہا ہے۔یہ واضح تضاد ہے البتہ وہ فرانس کے انسانی ضمیر سے مایوس نہیں ہے۔میرزا ادیب نے جمیلہ کی زبانی استعماری قوتوں کے تہذیبی فخر کو یوں چیلنج کیا ہے:

> اپنی تہذیب پر اتراتے ہو۔آؤ دیکھو آج تمھاری تہذیب ہماری لاشوں کے اوپر وحشیانہ ناچ، ناچ رہی ہے۔ وہ دیکھو تمھارا تمدن الجزائر کی تنگ و تاریک گلیوں میں بے گناہوں کی موت پر شیطانی قہقہے لگا رہا ہے۔وہ دیکھو تمھاری شاندار روایات ہمارے معصوم بچوں کے لہو سے اپنے خوب صورت ہاتھ رنگ رہی ہے۔(۵)

جمیلہ کو پھانسی چڑھانے سے ایک دن قبل، پھانسی کا حکم منسوخ کر دیا گیا مگر وہ شہادت کی آرزو پورا نہ ہونے پر افسردہ ہے کہ وہ پھانسی کی رسی نہ چوم سکی مگر الجزائر کے آزاد اور مقدس پرچم کو چومنے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔

ڈراما ''کالا آدمی'' بھی استعماری رجحانات اور احساسِ تفاخر کے ساتھ وطن پرستی کا نمائندہ ہے۔اس ڈرامے میں افریقہ پر تسلط جمائے استعماری قوتوں کے رویوں، رجحانات اور طریقِ حکومت کو پیش کیا گیا ہے۔آزادی کے نغمے ''جاگ اٹھا ہمارا افریقہ'' کی گونج ہر سو سنائی دے رہی ہے۔افریقہ کو آزادی دینے کے باوجود یورپی استعمار کے نمائندے فوجی افسران، لوگوں کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں۔آج وہ اس آواز کو وقت پر نہ دبانے کو اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہیں۔ وہ افریقہ کے کالے آدمی

کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور یورپ کا سب سے بڑا دشمن گردانتے ہیں۔ دو کالے آدمیوں کو آپس میں لڑانے کے استعماری فن پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے سیاہ فام دشمن کو ختم کرنے کے لیے، ایک دوسرے سیاہ فام کے دل میں اس کی نفرت پیدا کرتے ہیں اور وہ آئندہ اُسے حکومت سونپنے کا لالچ بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنے دشمن قیدی کو سامنے لاتے ہیں، اور اُس پر گولیاں برسا کر قتل کر دیتے ہیں۔ اگلے دن اس خبر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ گاؤں کے لوگوں نے اُسے مار دیا ہے۔ وہ آواز جو افریقہ کا نغمہ الاپتی سنائی دیتی تھی وہ اُسے خاموش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اس آواز کے مسلسل دکھ پہنچانے اور تکلیف میں مبتلا کرنے سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ اب انھیں لوگوں کے اُن کے خلاف ردعمل کی کوئی پروا نہیں تھی کیوں کہ اُنھوں نے ایسے دشمن سے نجات حاصل کی تھی، جس کی آواز پورے مشرق کے دل کی دھڑکن بن چکی تھی۔ تمام افسران خوشی کا جشن منا رہے ہوتے ہیں کہ پھر اُسی نغمے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس نغمے کی آوازوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ آوازوں کا طوفان، افسران پر دھاوا بول دیتا ہے۔ استعماری قوتوں کا آواز دبانے کا عمل، کبھی بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا بلکہ یہ انقلاب کے عمل کو مزید مہمیز کر دیتا ہے۔ میرزا ادیب کے ڈراموں میں استعماری قوتوں کے استعمال اور حب الوطنی کے جذبے کے موضوع کے برتاؤ کے حوالے سے ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں:

> وہ ڈرامے کے فن پر عبور رکھتے ہیں۔ ہم عصر معاشرے کے دکھی افراد کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ استحصالی قوتوں کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ حب الوطنی اور جذبہ حریت کی تصویر کشی کر کے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی تناظر میں ان کی افادیت کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔(۶)

ان کے ڈراموں میں ابتداً رومانیت اور دھیما پن نظر آتا ہے جو تدریجاً روح عصر اور اس کے تقاضوں کے بیانیے میں ڈھلتا ہے۔

مذکورہ بالا تجزیے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے ڈرامے مقصدی اور افادی پہلو کے حامل ہیں۔ ان کے کردار متوسط طبقے، اس کے مسائل، نفسیاتی الجھنوں، خوشیوں، غموں اور ضروریات کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے تخلیقی ضمیر میں بدیسی حکمرانوں کے استعمار پر براہ راست طنز کا انداز برصغیر کا اجتماعی ضمیر بن جاتا ہے۔

حواشی

(۱) میرزا ادیب، پسِ پردہ، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۳۶۔۱۳۷

(۲) ایضاً، ص ۱۷۴۔۱۷۵

(۳) ایضاً، ماموں جان اور ماموں جان، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۸ء)، ص ۳۴۔۳۷

(۴) ایضاً، آنسو اور ستارے، (لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۱۱۷

(۵) ایضاً، فصیلِ شب، (لاہور: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۸۲

(۶) حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر، میرزا ادیب کے ڈراموں کی انفرادیت، مشمولہ میرزا ادیب، شخصیت اور فن، مرتب: ڈاکٹر رشید امجد، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء)، ص ۴۹۷

مآخذ

(۱) ادیب، میرزا، پس پردہ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۵ء

(۲) ____، ماموں جان اور ماموں جان، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

(۳) ____، آنسو اور ستارے، لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ندارد

(۴) ____، فصیلِ شب، لاہور: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء

(۵) کاس گنجوی، حسرت، ڈاکٹر، میرزا ادیب کے ڈراموں کی انفرادیت، مشمولہ میرزا ادیب، شخصیت اور فن، مرتب: ڈاکٹر رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء